مقالات ومضامین

مدرسہ دیوبند کا فکری اور عملی منہج

قسط نمبر:۱

مولانا مفتی طارق محمود

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور حالات سے یقین ہو چلا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ ہندوستان بھی اسپین کی تاریخ دہرانے کے لیے تیار ہو چکا ہے، تو مسلمانوں کے دین کے تحفظ کے لیے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دیوبند میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی گئی۔ جسے آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا جاتا ہے۔(تاریخ دارالعلوم دیوبند: ص۱۲،۱۴ ملخصا، دارالاشاعت، کراچی، سنہ ندارد) زیرِ نظر مقالے میں اسی درسگاہ کا بنیادی تعارف درج ذیل ۱۲ نکات میں ملاحظہ فرمائیں: ۱: دیوبندی دراصل تعلیمی ادارے کی طرف نسبت ہے۔ ۲: عقیدہ اور کلام میں معتدل طرزِ فکر۔ ۳: حدیث وفقہ میں متوازن طریقہ۔ ۴: تصوف اور تزکیہ کا اہتمام۔ ۵: دین کے دفاع کی طرف خصوصی توجہ۔ ۶: تدریس وافتاء۔ ۷: دعوت وارشاد۔ ۸: تصنیف وتالیف۔ ۹: سیاسیات میں شرکت۔ ۱۰: استغناء اور توکل۔ ۱۱: متفرق تعلیمی خصوصیات: ا: کتاب وار نظامِ تعلیم۔ ب: طریق درس۔ ج: امتحان۔ د: مادری زبان میں تعلیم۔ ھ: خالص دینی تعلیم۔ و: بقدرِ ضرورت معقولات کی تعلیم۔ ۱۲: ختامہ مسک۔

۱: دیوبندی دراصل تعلیمی ادارے کی طرف نسبت ہے:

علمائے دیوبند یا جماعت دیوبند کی یہ نسبت دیوبندیت یا قاسمیت کوئی وطنی یا قومی یا فرقہ واری نسبت نہیں، بلکہ صرف ایک تعلیمی نسبت ہے جو مقامِ تعلیم (دیوبند) یا مدارِ روایت شخصیت حضرت قاسم العلوم کی نسبت سے (دیوبندی یا قاسمی) معروف ہوگئی ہے، جس سے اس جماعت کا تعلیمی انتساب اور اسکی روایت ودرایت کا استناد واضح ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فضلا علیگ کے لقب سے، یا جامعہ ملیہ دہلی کے فضلا جامعی کے نام سے، یا مظاہر علوم کے فضلاء مظاہری کے نام سے۔ علمائے دیوبند اپنے دینی رخ اور مسلکی مزاج کے لحاظ سے کلیۃً اہل السنّت والجماعت ہیں، نہ وہ کوئی نیا فرقہ ہے، نہ نئے عقائد کی کوئی جماعت ہے۔(علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص۲۲،۲۳، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: اول، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء)

۲: عقیدہ اور کلام میں متوازن طرزِ فکر:

قال مولانا الشیخ خلیل احمد السهارنفوری: إنا – بحمدالله ومشائخنا رضوان الله علیهم أجمعین وجمیع طائفتنا وجماعتنا – مقلدون لقدوة الأنام وذروة الإسلام الإمام الهمام

الإمـام الأعظم أبى حنيفة النعمان رضى الله تعالى عنه فى الفروع، ومتبعون للإمام الهمام أبى الـحسـن الأشـعـرى والإمـام الهـمـام أبـى مـنـصـور الماتريدى رضى الله عنهما فى الاعتقاد والأصـول، ومنتسبون من طرق الصوفية إلى الطريقة العلية المنسوبة إلى السادة النقشبندية، والـطـريـقـة الـزكية المنسوبة إلى السادة الجشتية، وإلى الطريقة البهية المنسوبة إلى السادة الـقـادرية، وإلى الطريقة المرضية المنسوبة إلى السادة السهروردية رضى الله عنهم أجمعين (المهند(المترجم) :ص ۲۹، ۳۰،ادارہ اسلامیات،لاھور ط:۱۴۰۴/۱۹۸۴)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: ہم اور ہمارے مشائخ اور ہماری ساری جماعت بحمد اللہ فروعات میں مقلد ہیں مقتدائے خلق حضرت امام ہمام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ،اوراصول واعتقادات میں پیرو ہیں امام ابوالحسن اشعری اورامام ابومنصور ماتریدی رضی اللہ عنہما کے۔اورطریقہائے صوفیہ میں ہمیں انتساب حاصل ہے سلسلہ عالیہ حضرات نقشبندیہ،اورطریقہ زکیہ مشائخ چشت اورسلسلہ بہیہ حضرات قادریہ اورطریقہ مرضیہ مشائخ سہروردیہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ۔

قـال الامـام الشيـخ أنورشاه الكشـميرى رحمه الله تعالى: أثبت شىء فى هذا الباب (أى فـى مـعتـقد الأئمة الحنفية) عقيدة الطحاوى، وأحسن شروحه شرح القونوى.(فيض البارى مع البدر السارى : ۱/۱۳۴ ،دار الكتب العلمية ،بيروت،ط:۱۴۲۶)

حضرت مولانا انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:ائمہ حنفیہ کے عقیدے کے بارے میں سب سے زیادہ قابل اعتماد دستاویز عقیدہ طحاویہ ہے۔اوراس کی سب سے عمدہ شرح قونوی کی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: دیوبندیت کوئی مستقل مذہب نہیں۔سلف اور جمہور اہل سنت و الجماعت کے مکمل اتباع ہی کا نام دیوبندیت ہے۔جوعقیدہ جمہور اہل سنت والجماعت کے خلاف ہے،وہ دیوبندیت کے بھی خلاف ہے۔(حیات انبیائے کرام:ص۶۰،المکتبۃ الاشرفیہ،جامعہ اشرفیہ،لاہور،ط:سنہ ندارد)

اورفرماتے ہیں:''بے کم وکاست ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتب عقائد اہل السنّت والجماعت کودیکھ لیجیے،جوعقائد ان تمام کتابوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں علمائے دیوبندانھیں عقائد کے زبردست حامل اوران کے خلاف کرنے والوں کی تردید میں پیش پیش ہیں''۔(المہند (مترجم):ص۱۷۵)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:حضرات متکلمین نے حق تعالی کی ذات وصفات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ درحقیقت اہل بدعت والحاد کی مدافعت ہے۔اس کوعلمی اصطلاح میں صرف منع (احتمال ظاہر کرنے)

کے درجے میں رہنا چاہیے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی صورت ہوتو یہ ممکن اور محتمل ہے، محال نہیں۔ یہ نہیں کہ واقع میں عنداللہ ایسا ہی ہے، مگر ہو یہ گیا کہ متاخرین متکلمین بجائے مانع بننے کے مدعی بن بیٹھے، اور اپنے پیدا کیے ہوئے احتمالات کو اسلام کے عقیدہ کا درجہ دے دیا۔ اس لیے میں تو یہ کہتا ہوں کہ علم کلام کو صرف مدافعت اہل بدعت اور منع اصطلاحی یعنی احتمال و امکان کے درجے میں رکھنا چاہیے، اور عقائد کو مثل سلف صالحین کے ان مباحث سے سادہ رکھنا چاہیے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۴/ ۱۵۹، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۲ھ، اور دیکھیے: ملفوظات حکیم الامت: ۲۶/ ۲۷، ط: ۱۴۲۵ھ اور ۲۶/ ۲۳۲، ط: ۱۴۲۵ھ)

اور فرماتے ہیں: ایک غیر مقلد صاحب کی عنایت سے ایک رسالہ اور لکھنا پڑا ''تمہید الفرش فی تحدید العرش''، جس میں استواء علی العرش کی بحث ہے، گو صفات کے باب میں کلام کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اس سے ہمیشہ میں خود بھی منع کرتا ہوں اور اپنے بزرگوں کو بھی اس سے بچتے دیکھا ہے۔ باقی متقدمین نے جو اس میں کچھ کلام کیا ہے وہ منع کے درجہ میں تھا، متأخرین نے دعوی کے درجہ میں کر لیا اور اب تو اس میں بہت ہی غلو ہو گیا، بلا ضرورت کلام کرنے کو میں خود بدعت سمجھتا ہوں، مگر بضرورت کلام کرنا پڑتا ہے، سلف کا یہی عمل تھا۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۶/ ۱۰۱، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ) رسالہ تمہید الفرش فی تحدید العرش، آیات صفات کے غامض مبحث میں انتہائی شاندار تحقیق ہے۔ (دیکھیے: امداد الفتاوی: ۶/ ۲۶- ۶۲، مکتبہ دار العلوم کراچی، ط: ۱۴۳۱ھ)

اور فرمایا: متکلمین نے مسائل کلامیہ میں جتنے دعوے کیے ہیں ان میں سے بعض پر جزم نہیں کرنا چاہیے۔ مثلا وہ کہتے ہیں کہ رویت بے کیف ہوگی، بے جہت ہوگی۔ صحابہ کا تو مذہب اس میں یہ تھا کہ کیا خبر کیسی ہوگی؟ واللہ اعلم۔ ان تفصیلات کی وجہ سے بعض متقدمین ان متکلمین کے پیچھے نماز پڑھنے کو مکروہ کہتے ہیں جیسے بدعتی کے پیچھے۔ مگر میری سمجھ میں الحمدللہ اس کا فیصلہ آ گیا۔ وہ یہ کہ اگر ان تفصیلات کو باطل فرقوں کے دعووں کے مقابلے میں منع کے درجے میں رکھا جائے، دعوی نہ کیا جائے، گو بصورت دعوی کے ہوں، مگر مقصود دعوی نہ ہو، تو بدعت نہیں۔ اور دعوی واقعی خطرناک ہے۔ میں تو اسی توجیہ کی بنا پر متکلمین کا بے حد معتقد ہوں، انھوں نے حق کی بڑی نصرت کی ہے، اور یہ نصرت بڑی عبادت ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۳/ ۲۳۴، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۳ھ)

اور فرمایا: فرق باطلہ اور اہل بدعت کی وجہ سے اہل حق کو کلام کرنا پڑا، ورنہ اہل حق فی نفسہ اس قسم کے کلام کرنے کو پسند نہیں کرتے، اس لیے کہ سلف سے منقول نہیں۔ اور میں بھی پسند نہیں کرتا، مجھ کو ہمیشہ اس قسم کے قیل و قال سے نفرت ہے، مگر بیچارے اہل حق کو اہل باطل کی گڑ بڑ کی وجہ سے بولنا پڑا اور یہ ان کا بولنا ضرورت کی وجہ سے تھا۔ یعنی اول اہل بدعت نے دین میں شبہات نکالے، اہل حق نے ان کو دلیل کے ساتھ دفع کیا، جس سے صورت مناظرہ کی

پیدا ہوگئی اور علم کلام مدون ہوگیا۔ پس ایسے مسائل میں اہل حق مدعی نہیں، بلکہ اہل بدعت مدعی ہیں۔ اور اہل حق انکے مقابلہ میں مانع ہیں۔ پھر اضطرار کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ اس کلام اور مناظرہ کے کچھ حدود اور شرائط بھی تھے، مگر بعض متأخرین نے اس کو بڑھالیا اس حد تک رکھا نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت:۴/۳۰۹، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ط: ۱۴۲۳ھ)

حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: اس قسم کی آیات (آیات صفات) میں ہمارا مذہب یہ ہے کہ ان پر ایمان لاتے ہیں، اور کیفیت سے بحث نہیں کرتے۔ اور ہم یقیناً جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالی مخلوق کے اوصاف سے منزہ اور نقص وحدوث کی علامات سے مبرا ہے، جیسا کہ ہمارے متقدمین کی رائے ہے۔ اور ہمارے متأخرین اماموں نے ان آیات میں جو صحیح اور لغت وشرع کے اعتبار سے جائز تأویلیں فرمائی ہیں تاکہ کم فہم سمجھ لیں، مثلا یہ کہ ممکن ہے کہ استوا سے مراد غلبہ ہو، اور ہاتھ سے مراد قدرت۔ تو یہ بھی ہمارے نزدیک حق ہے۔ البتہ جہت ومکان کا اللہ تعالی کے لیے ثابت کرنا ہم جائز نہیں سمجھتے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ وہ جہت ومکانیت اور جملہ علامات حدوث سے منزہ وعالی ہے۔ (المھند مترجم: ص۴۸)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: اس تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ دونوں طریق (سلف اور خلف کے آیات صفات میں) علمائے اہل سنت اور اہل حق کے ہیں۔ ان میں سے کسی کی تجہیل یا تضلیل جائز نہیں، گو ترجیح فی نفسہ مسلک سلف کو ہے، اور عارض کے سبب مسلک خلف پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ (امداد الفتاوی: ۶/۳۴)

اس مقام پر مناسب ہے کہ علم کلام کی تدوین کی ضرورت پر تاریخی پس منظر میں ایک نگاہ ڈالی جائے، تاکہ علم کلام کا صحیح درجہ اور معتدل حیثیت، جو اوپر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات میں مذکور ہے، اسکی مزید وضاحت ہوجائے۔

علم کلام کی تدوین کا تاریخی پس منظر اور ضرورت:

معتصم اور واثق کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا۔ واثق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت واقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بے دخل کردیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا۔ خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھوچکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے۔ معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کرلیا تھا۔ اور قضا وافتا اور حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہوگیا۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا

جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر، وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں۔ اوران کی آراء وتحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے۔

امام احمد کے بعد حنابلہ میں کوئی طاقتور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔ محدثین اوران کے ہم مسلک علماء نے علوم عقلیہ اور نئے طریقہ بحث ونظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا)، توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ کی مجلسوں اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلڑا ابھاری رہتا۔ اور جولوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے، اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر، حاضر جوابی اور علمی موشگافی سے متاثر ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری اور اسکی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہورہی تھی۔ خود محدثین اوران کے تلامذہ کے گروہ کے بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے، اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے مرعوب ہورہے تھے۔ یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لیے سخت خطرناک تھی۔ قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام ان فلسفی نما مناظرین کے لیے بازیچہ اطفال بنے جارہے تھے۔ مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہورہی تھی۔ یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی۔ اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے نہ تو محدثین وحنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا۔ نہ عابدوں وزاہدوں کا زہد وعبادت، اور نہ فقہاء کے فتاوی اور جزئیات ومسائل پران کا عبور واستحضار۔

اس کے لیے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں۔ جو عقلیت کے کوچے سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نوردرہ چکا ہو۔ جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت اور فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں۔ اور ایسے پست وحقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نوعمر بچے۔ اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام اہل سنت کی ضرورت تھی۔ اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔ (تاریخ دعوت وعزیمت: ۱/۱۰۳،۱۰۴، مجلس نشریات اسلام، کراچی، سنہ ندارد)

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل اور متوسط مسلک اختیار کیا۔ وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الہیات کے بارے میں اور مابعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف عمل کرسکے اور اس کے جزئیات وتفصیلات اور ذات وصفات باری تعالی کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر

کر سکے اور اس کو معیار قرار دیا جا سکے۔ نہ وہ بعض پر جوش محدثین وغالی حنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کیلیے عقل کا انکار اور اسکی تحقیر ضروری سمجھتے تھے۔ اور ان کلامی واعتقادی مباحث جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے احتیاط وسکوت واجب سمجھتے تھے۔ وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے، جس سے مذہب وعقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا۔ (مصدر سابق: ۱/ ۱۰۸)

ان (امام ابوالحسن اشعری) کا اصلی کارنامہ اس مسلک سنت اور عقیدہ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی تائید نہیں۔ یہ تو محدثین اور عام حنابلہ کر ہی رہے تھے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب وسنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا۔ اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول ومعقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔ دین کی (اس) اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم الشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور منحرف فرقوں کے معتوب بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان متشدد محدثین اور جامد حنابلہ کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث ومسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک زیغ وضلال کی بات تھی۔ (مصدر سابق: ۱/ ۱۱۰، ۱۱۱)

ان (امام ابوالحسن اشعری) کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی ونبوت محمدی ہے اور اس کا ذریعہ علم کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے اقوال وروایات ہیں۔ اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ وفلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے، لیکن وہ ان حقائق وعقائد کے ثبوت میں تائید کے لیے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ واصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بناء پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں۔ نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات وحسیات سے ہے اور معتزلہ وفلاسفہ نے ان کو (خوامخواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنا دیا ہے اور اپنی ذہانت اور زبان آوری سے ان کو حق وباطل کا معیار قرار دے دیا ہے امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست نہیں۔ شریعت کے وکیل اور ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ (مصدر سابق: ۱/ ۱۱۱)

محافظین شریعت اور متکلمین اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد والہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں ان کا جواب دین اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت ومدلل کریں۔ امام ابوالحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ایک مستقل رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام تصنیف کیا۔ (مصدر سابق: ۱/ ۱۱۲)

معتزلہ سے ہروقت برسرمقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن (اشعری) کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آ گئی تھیں۔اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا۔امام ابومنصور (ماتریدی) نے حشو وزوائد اور ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے،اور ان کا ثابت کرنا اور نباہنا مشکل تھا خارج کر دیا اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح وتہذیب کی اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنادیا۔امام ابومنصور اور ان کے متبعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا۔ایسے مسائل جن میں ماتریدیین نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے تیس چالیس سے زیادہ نہیں،اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔(مصدر سابق:۱/۱۱۵)

چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت وحنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی جو چوتھی صدی میں اعتزال وسنیت کے اختلاف کی تھی۔اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے۔اور حنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے۔ہر گروہ خوش نیتی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت وشریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا۔لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا۔اور رائی کا پہاڑ بن گیا۔تحزب وتعصب نے اس کو بھی کفر وایمان کا معیار قرار دے دیا۔(مصدر سابق:۲/۲۸۹،حاشیہ۱)

اسلامی عقائد کے دفاع میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کی امتیازی شان:

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:نصوص صریحہ سے ثابت شدہ عقائد تقریباً سب کے یہاں متفق علیہ ہیں۔اس لیے ان میں علاوہ نص کتاب وسنت کے اجماع بھی شامل ہے،لیکن استنباطی یا فروعی عقائد یا قطعی عقیدوں کی کیفیات وتشریحات میں ارباب فن کے اختلافات بھی ہیں۔اس لیے ان میں یکسوئی حاصل کرنے کے لیے متکلمین کے بابصیرت ائمہ میں سے کسی کا دامن سنبھالنا اسی طرح ضروری تھا جس طرح فقہیات اور اجتہادی اختلافات میں ایک فقہ معین کی پابندی ضروری تھی۔اس سلسلہ میں اول تو علمائے کلام کے بارہ میں علمائے دیوبند کا عمومی ذوق ومشرب یہ ہے کہ وہ متکلمین کے اختلافات میں پڑ کر کسی طبقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے، بلکہ تمام متکلمین کی عظمت قائم رکھ کر حتی الامکان انھیں جوڑنے ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ثانیاً اس بارہ میں بھی فقہ معین کی طرح کلام معین سے وابستہ رہتے ہوئے بھی تحقیق کا سرا انھوں نے ہاتھ سے نہیں دیا۔کلامی مسائل میں خصوصیت کیساتھ علمائے دیوبند میں قاسمیت کا رنگ غالب ہے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند کی حکیمانہ تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ان مسائل کے اثبات میں حضرت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اشاعرہ اور ماتریدیہ کے اختلافات میں ردوقدح کی راہ اختیار نہیں فرمائی، بلکہ اہم اور بنیادی مسائل میں رفع

اختلاف اور تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار فرمایا، جس سے کلامی مسائل کا بڑے سے بڑا اختلاف نزاع لفظی محسوس ہونے لگتا ہے۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۵۱، ۱۵۲)

قاسم ثانی مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت نانوتوی قدس سرہ کے بارے میں لکھتے ہیں: اور یہی وہ فاضل ہے جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بنا ڈالی جو ان شاء اللہ قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے۔ اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج کیے ہیں وہ اس مسئلہ عقل ونقل میں ہماری بہت زیادہ مشکل کشائی کرتے ہیں۔ (کمالات عثمانی: ص ۳۹۶، مولانا محمد انوار الحسن انور قاسمی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۷ھ)

علمائے دیوبند اشعری ہیں یا ماتریدی؟

اس مرحلہ پر پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کلامی مسائل میں جبکہ مسلمہ امام دو ہی ہیں، ایک امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایک امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ تو علمائے دیوبند اشعری ہیں یا ماتریدی؟ اس بارہ میں خود علمائے دیوبند ہی کے عرف میں تو وہ ماتریدی ہی کی نسبت سے معروف ہیں، لیکن انھی میں سے ایک جماعت ان کے اشعری ہونے کی رائے بھی رکھتی ہے۔ اولا اس لیے کہ انکے علمی مورث اعلیٰ حضرت الامام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، انکے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اشعری ہیں، اس لیے علمائے دیوبند کو بھی وہ اشعری سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ اکابر دیوبند اپنے درسوں، تقریروں اور قلمی تحریروں میں مسائل اشعریت کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن لقب کے لحاظ سے ان دونوں قولوں کو سامنے رکھ کر جو وجوہ قبول سے خالی نہیں ہیں، انکے ماتریدیت اور اشعریت کے ملے جلے رخ کو سامنے رکھ کر، اگر انھیں اشعریت پسند ماتریدی کہا جائے تو ان کے کلامی مزاج کے حسب حال ہوگا، جبکہ وہ جامع بین الاشعریت والماتریدیت ہی نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کے جامعیت آفریں مباحث کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اشعریت اور ماتریدیت کے اختلافات آخر کار نزاع لفظی ثابت ہوتے ہیں۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۵۶، ۱۵۷)

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے، وہ یہ کہ میں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں، اسلام کے مذاہب اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہوگا، ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گُر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا۔ اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیے، اللہ تعالیٰ کی جو تایید اس کے ساتھ رہی ہے جس کے شواہد وقرائن ساری

تاریخ میں موجود ہیں۔(خطبات علی میاں:۱/ ۳۴۸،ت:مولانا محمد رمضان میاں،دارالاشاعت کراچی،ط:۲۰۰۲م)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں جرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابوالحسن اشعری اور ابوالمنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں جو اسلامی معتقدات کے متعلق ان تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے نئے پیرایہ میں ظاہر کئے جائیں قدیم علم کلام کے کامل اور مکمل ہونے کا ثبوت دے سکیں۔یہ عبارت علامہ عثمانی کی اس کلامی طاقت کا بے پناہ ظہور ہے۔جو ان کے اندر قدرت نے ودیعت کر رکھی تھی۔اس عبارت میں غائبانہ انداز میں اپنے آپ کو امام ابوالحسن اشعری کا وکیل ہونے کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں اور لاریب یہ بات ان کی زبان پر پھبتی ہے۔

اور فرماتے ہیں:علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لیے مدون کیا گیا میرے نزدیک اس نے اس میں پوری کامیابی حاصل کی۔اور اب میرا قصد ہے کہ میں اسلامی عقائد کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاؤں کہ علمائے اسلام نے اس تحقیق کو کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔اور اب ہم کو اس میں کہاں تک ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہے۔(کمالات عثمانی:ص۴۰۰،۴۰۱)

۳:حدیث وفقہ میں متوازن طریقہ

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: غرض علمائے دیوبند کے مسلک میں محض قوت سند یا اصح مافی الباب ہونا اصل نہیں، بلکہ بصورت جمع مناطِ حکم اور بصورت ترجیح تفقہ اصل ہے، کیونکہ صحت سند سے زیادہ سے زیادہ حدیث کے ثبوت کی پختگی معلوم ہوسکتی ہے،لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو حدیث زیادہ ثابت ہو وہ اس دائرہ کا بنیادی فقہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو۔پس اگر اصح مافی الباب حدیث لے لی جائے جس میں صرف حکم مسئلہ موجود ہے،اور غیر اصح مگر قابل احتجاج بوجہ غیر اصح ہونے کے ترک کردی جائے جس میں حکم مسئلہ کے ساتھ علت حکم اور مناطِ حکم بھی موجود ہے،تو حکم بلا علت کے رہ جائے گا،اور جبکہ علت حکم ہی سے یہ حکم اپنی دوسری امثال میں بھی پہنچ سکتا تھا جو اس حکم کے پھیلاؤ اور وسعت کی صورت تھی،اور یہ علت محض اس لیے متروک ہوگئی کہ اس کا ماٰ خذ اصح مافی الباب نہ تھا، بلکہ اپنی روایات سے نسبتہً ضعیف السند تھا،تو یقیناً اس حکم کی جامعیت اور مخزن امثال ہونا ختم ہوجائے گا،جس سے فقہ کی وسعت بھی ختم ہوجائے گی اور متبعین کی وسعت فہم بھی باقی نہ رہے گی،اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ قوتِ سند کے ساتھ اس سے زیادہ مناطِ حکم کی تخریج وتحقیق اور تنقیح وتفقہ رواۃ پر زور دیتے ہیں،جس سے حکم کی قوت بھی نمایاں ہوتی ہے اور وسعت بھی......پھر صحیح روایتیں تو بجائے خود ہیں،ضعیف روایتیں بھی جو قابل احتجاج ہوں

ہاتھ سے جانے نہیں پائیں گی۔اس لیے تطبیق روایات اور جمع بین الروایات حنفیہ کا خاص اصول ہے جس پر وہ زیادہ زور دیتے ہیں، تا کہ کوئی روایت حدیث چھوٹنے نہ پائے، مگر پھر بھی تعصّبا انھیں قیاس کہہ کر تارکِ حدیث کا خلاف واقعہ لقب دیا جاتا ہے۔حالانکہ حنفیہ اپنے جامع اصول کے لحاظ سے خود ہی صاحب فقہ نہیں، بلکہ وہ اصولا تمام فقہوں کے جامع اور محافظ بھی ہیں، اور اسی لیے شاید حضرت الامام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ **الناس فی الفقہ عیال علی ابی حنیفۃ**۔البتہ اس جمع بین الروایات اور تحقیق و تنقیح مناط کی وجہ سے حنفیہ کے یہاں بلاشبہ توجیہات کی کثرت ہے کہ اس کے بغیر روایات باہم جڑ کر حکم کا جامع نقشہ نہیں پیش کر سکتیں، مگر یہ توجیہات تاویلات محضہ یا تخمینی باتیں نہیں، بلکہ اصول اور نصوص سے مؤید ہونے کی وجہ سے تقریبا حدیث کی تفسیرات کے ہم پلہ ہوتی ہیں۔اس لیے حدیث کے بارہ میں علمائے دیوبند کے مسلک کا عنصر وہی جامعیت واعتدال ہے، جس میں نہ تشدد ہے نہ تساہل، بلکہ وہ روایات کے ساتھ تمام ائمہ کے اصول ساتھ لیکر چلتا ہے۔(علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج:ص۱۴۹تا۱۵۱)

شیخ رشید رضا مصری ۲۷ربیع الاول ۱۳۳۰ھ/ ۱۵اپریل ۱۹۱۲ءکو دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔اس موقع پر حضرت انور شاہ قدس سرہ نے عربی میں برجستہ ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔علمائے دیوبند کے حدیثی و فقہی منہج کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا:

غاية المدرسة (الديوبندية) درس الحديثِ وفقة الحديث .وكان يرى (الشيخ محمد قاسم النانوتوى رحمه الله تعالى) أن المبادى ضرورية، والضرورى يقدر بقدرالضرورة .وطريقة مشائخنا فِى الحديث وفقه الحديثِ طريقة معتدلة مثلى يتوسطون بين الأطراف .أريد بذلک أن للائمة الأربعة أُصولا أربعة أكثرية .وذالک إن الامام مالک يتأسى بعمل أهل المدينة، بل قد يرجحه على الحديث المرفوع، والشافعي يأخذ بأصح مافي الباب، وأحمد يأخذ بالأصح و الصحيح والحسن والضعيف إذا كان ضعفه يسيرا .ويجوز هذا وذلک. وعلى هذا وضع مسنده .وأبو حنيفه يأخذ بهذه الأقسام، وينزل الأحاديث على محامل . فلذا كثرت التأويلات عند الحنيفه، وكثرت الجروح على الراوة عند الشافعية....فمشائخنا يتوسطون فى مثل هذا، لا يأخذون بالتشدد ولابالتساهل، ويوجهون الأحاديث المتعارضة بتوجيهات يكاد يقبلها من يسمعها .مثاله حديث القلتين ....ومثاله أيضا أحاديث القرائة خلف الإمام ....وقالوا فى مسئلة رفع اليدين وجهر آمين ....(ماہنامہ الرشید: دارالعلوم

دیوبند نمبر: ص ۲۴۳ تا ۲۴۷، ج ۴، ش ۲، ۳، صفر و ربیع الاول ۱۳۹۶ھ/ فروری، مارچ ۱۹۷۶ء، جامعہ رشیدیہ، ساہیوال)

مدرسہ دیوبند کا مقصد حدیث اور فقہ الحدیث کا درس ہے۔ شیخ محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالی کی رائے یہ تھی کہ مبادی مقصود لغیر ہا ہیں۔ اور ایسی چیز بقدر ضرورت ہی رکھی جاتی ہے۔ اور حدیث اور فقہ الحدیث میں ہمارے مشائخ کا طریقہ، معتدل مثالی اور انتہاؤں کے درمیان ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے چار اکثری اصول ہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ امام مالک اہل مدینہ کے عمل کی پیروی فرماتے ہیں، بلکہ اسے حدیث مرفوع پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور امام شافعی اصح مافی الباب کو لیتے ہیں۔ اور امام احمد صحیح، حسن اور ضعیف جس کا ضعف ہلکا ہو، ان سب کو لیتے ہیں۔ اور ہر ایک پر عمل درست قرار دیتے ہیں۔ اور اسی اصول پر انھوں نے اپنی مسند ترتیب دی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ ان سب قسموں کو لیتے ہیں اور احادیث سے مناسب معانی مراد لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں تاویلات کی کثرت ہے۔ اور شافعیہ کے ہاں راویوں پر جرحوں کی کثرت ہے...... تو ہمارے مشائخ ان امور میں درمیانہ راستہ اختیار کرتے ہیں، نہ تشدد اپناتے ہیں اور نہ ہی تساہل کا شکار ہوتے ہیں۔ اور احادیث متعارضہ کی ایسی توجیہات پیش کرتے ہیں کہ جنھیں سننے والا قبول کرنے لگتا ہے۔ اس کی مثال حدیث قلتین ہے...... اور اسکی مثال قراءت خلف الامام کی احادیث بھی ہیں، اور ہمارے مشائخ رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلے میں فرماتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

کسی بھی شخص یا جماعت کی حمایت ومخالفت کی حدود

آج کل یہ عمومی رواج بن گیا ہے کہ خوش گپیوں کے دوران یا فارغ وقت گذارنے کے لئے یا جہاں چار آدمی جمع ہوتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ، غیبت، بہتان تراشی یا بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی دنیا اور آخرت کا بڑا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم اپنے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح "میرے والد میرے شیخ" میں لکھتے ہیں:...... کسی شخص یا جماعت کی حمایت ومخالفت میں جب نفسانیت شامل ہو جاتی ہے تو نہ حمایت اپنی حدود پر قائم رہتی ہے نہ مخالفت، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کی حمایت کرنی ہو اسے سراپا بے داغ اور جس کی مخالفت کرنی ہو اسے سراپا سیاہ ثابت کرنے سے کم پر بات نہیں ہوتی۔ آج کل حمایت ومخالفت میں اس قسم کے مظاہرے عام ہو چکے ہیں، بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس زمانے میں منظور نظر ہوا تو اس کی ساری غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے تعریف وتوصیف کے بانس پر چڑھا دیا گیا، اور جب وہی شخص کسی وجہ سے زیر عتاب آ گیا تو اس کی ساری خوبیاں ملیا میٹ ہو گئیں اور اس میں نا قابل اصلاح کیڑے پڑ گئے۔ بعض اوقات جب عام فضا کسی شخص یا جماعت کے خلاف ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں الزام تراشی اور افواہ طرازی کو عموماً عیب نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے عیوب کی خبریں لانے میں لطف محسوس کیا جاتا ہے اور اس میں تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ حضرت والد صاحب ایسے مواقع پر اپنے متعلقین کو اس طرز عمل سے سختی کے ساتھ روکتے اور فرماتے کہ اگر ایک شخص کسی جہت سے برا ہے تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ اس کی تمام جہات لازماً بری ہوں گی اور اب اس کی بے ضرورت غیبت اور اس کے خلاف بہتان تراشی جائز ہو گئی ہے۔ (میرے والد میرے شیخ: 147-149)

مدرسہ دیوبند کا فکری اور عملی منہج

(......قسط دوم......)

مولانا مفتی طارق محمود

علمائے دیوبند کی تحقیق میں بھی فقہ حنفی اقرب الی الحدیث ہے:

مولانا ظفر احمد عثمانی حضرت تھانوی کا قول نقل کرتے ہیں: مولانا (حضرت نانوتوی قدس سرہ) بڑے دعوے سے فرمایا کرتے تھے کہ اقوال ابی حنیفہ کو حدیث کے موافق ثابت کرنے کا میں ذمہ لیتا ہوں، لیکن تخریجات فقہاء کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ جن لوگوں نے مولانا کی تقریر درس حدیث میں سنی ہے وہ اس کے شاہد ہیں کہ واقعی مولانا اقوال ابی حنیفہ کی تقریر ایسی کرتے تھے جن کے بعد وہ بالکل حدیث کے موافق نظر آتے تھے۔ حدیث کو قول ابی حنیفہ کے مطابق نہیں کرتے تھے، کہ اس کا خلاف ادب ہونا ظاہر ہے۔ بلکہ قول ابی حنیفہ کو حدیث کے مطابق کر دیا کرتے تھے۔ (قاسم العلوم: ص۶۳۲، ۶۳۳، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مجلّہ صحیفہ نور، کاندھلہ، مکتبہ سید احمد شہید، لاہور، ط: رمضان ۱۴۲۱ھ/ دسمبر ۲۰۰۰م) حضرت نانوتوی کی ان تقریرات کی ایک جھلک حاشیہ سوانح قاسمی: ۲/۲۴۲، ۲۴۳، مولانا مناظر احسن گیلانی، مکتبہ دار العلوم، دیوبند، ط: ۱۳۷۳ھ میں ملاحظہ فرمائیں۔

آپ (حضرت گنگوہی قدس سرہ) بارہا فرمایا کرتے تھے کہ مجھے حنفیہ مذہب سے خاص محبت ہے، اور اس کی حقانیت پر کلی اطمینان ہے۔ (تذکرۃ الرشید: ۱/۹۱، مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶م)

حضرت تھانوی قدس سرہ کا ارشاد ہے: مذہب حنفی کو بعضے نادان حدیث سے بعید سمجھتے ہیں، مگر مذہب میں اصل چیز اصول ہیں۔ سو ان کے اصول کو دیکھا جائے تو سب مذاہب سے زیادہ اقرب الی الحدیث ہیں۔۔۔۔۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ حنفیہ کے اصول پر نظر نہ کرنے سے ان کو ہمیشہ بدنام کیا گیا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۵/۹۲، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ)

حضرت انور شاہ قدس سرہ فرماتے ہیں: ہم نے اپنی عمر کے تیس سال یہ دیکھنے کے لیے صرف کر دیے کہ فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے یا نہیں؟ سو ہم اپنی تیس سالہ محنت کے بعد قطعاً مطمئن ہیں۔ جہاں جس درجہ کی حدیث دوسرے فقہاء کے پاس ہے اس درجہ کی حدیث امام ابوحنیفہ کے پاس بھی ہے۔ اور جہاں حدیث نہ ہونے کی بنا پر

امام اعظم نے مسئلہ کی بنیاد قیاس واجتہاد پر رکھی ہے وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔(نقش دوام :ص۱۷۵،مولانا انظر شاہ مسعودی،شاہ بک ڈپو،دیوبند،سنہ ندارد)

حضرت گنگوہی قدس سرہ کا مشہور مقولہ ہے کہ حدیث کو جتنی سرسری نظر سے دیکھا جائے گا وہ اتنی ہی حضرات حنفیہ کے خلاف ہوگی۔اور جتنا حدیث پاک میں توغل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام حدیثیں حنفیہ کے موافق ہیں۔(تقریر بخاری حضرت مولانا محمد زکریا:۱/ ۱۲۷،۱۲۸،ت:مولانا محمد شاہد،مکتبۃ الشیخ،کراچی،ط:سنہ ندارد)

علمائے دیوبند جامد مقلد نہیں، بلکہ تقلید میں محقق ہیں:

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:پس وہ (علمائے دیوبند) بلاشبہ مقلد اور فقہ معین کے پابند ہیں،مگر اس تقلید میں محقق ہیں، جامد نہیں۔تقلید ضرور ہے مگر کورانہ نہیں۔لیکن اس شانِ تحقیق باوجود بھی وہ اور ان کی پوری علمی ذریت اپنے کو اجتہاد مطلق کا اہل نہیں سمجھتی۔البتہ فقہ معین کے دائرے میں رہ کر مسائل کی ترجیح اور ایک ہی دائرہ کی متماثل یا متخالف جزئیات میں سے حسب موقع ومحل،اور حسب تقاضائے ظروف زمان ومکان کسی خاص جزئی کے اخذ وترک یا ترجیح وانتخاب کی حد تک وہ اجتہاد کو منقطع بھی نہیں سمجھتے،اس لیے ان کا مسلک کورانہ تقلید اور اجتہاد مطلق کے درمیان ہے۔(علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج:ص۱۴۳)

مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:حنفیہ ہمیشہ اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں جو مضمون قرآنی کے موافق ہو،اگرچہ دوسری طرف کے روایت کرنے والے ان کی بہ نسبت زیادہ ثقہ یا تعداد میں زیادہ ہوں۔(اختلاف الائمہ مع الاستدارک:ص۷۲،ت:مولانا محمد عثمان،مولانا محمد عبدالرزاق،مکتبۃ الحرمین،لاہور، ط:۱۴۳۱ھ)

اور ارشاد ہے:عمل بالحدیث کرنے والے کا بڑا فرض ہے کہ ان سب (وجوہ ترجیح) کی تحقیق کرنے کے بعد دیکھے کہ کون سی روایت میں وجوہ ترجیح زیادہ پائی جاتی ہیں۔تاکہ وہ اس کو دوسری متعارض روایات پر ترجیح دے سکے۔اسی وجہ سے حنفیہ ان روایات کو بھی ترجیح دیتے ہیں جو قوت سند یا علو سند کے لحاظ سے زیادہ راجح نہیں ہوتیں۔اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک کسی مضمون کا اوفق بالفاظ القرآن ہونا قوی تر وجوہ ترجیح میں سے ہے۔اور یہ امر نہایت بدیہی ہے اس لیے کہ الفاظ حدیث کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہونا یقینی نہیں۔رواۃ کا بالمعنی حدیث نقل کرنا پہلے بیان ہو چکا ہے۔اور الفاظ قرآنی کا بلفظہ منقول ہونا قطعی ہے۔اس لیے مختلف روایات کے مضمون میں جو مضامین الفاظ قرآنیہ سے زیادہ قریب ہوں گے اس کا راجح ہونا یقینی اور بدیہی امر ہے۔(مصدر سابق:ص۱۱۴) اس مضمون کی مثالوں سے وضاحت کے لیے دیکھیے :اوجز المسالک :۲/ ۹۵،۹۶،ت:تقی الدین ندوی ،دار القلم ،دمشق،

ط: اولی، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳م)

یہاں حضرات اساتذہ کرام کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ حدیث اور فقہ کے درس میں، سادات حنفیہ کے دلائل حدیث کی وضاحت ان کے اپنے اصول کے اجراء اور تمرین کے ساتھ فرمائیں۔ حنفیہ کے اپنے اصول سامنے نہ لانے کی وجہ سے طلبہ کی تشنگی دور نہیں ہوتی۔ وقتی طور پر اگرچہ نہ بولیں، لیکن مروج طریقے سے ان کی تشفی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں بندہ کے ایک دوسرے مقالے سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ اس کا عنوان ہے: محدثین اور فقہاء کے اصول حدیث کا تقابلی جائزہ۔ یہ مقالہ المصباح لاہور سے مطبوع خیر الاصول کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ طلبہ پر یہ ضرور واضح فرمائیں کہ کونسا کلام علی سبیل التسلیم والتنزل ہے، اور کونسا کلام علی سبیل التحقیق والترقی۔

۴ : تصوف اور تزکیہ کا اہتمام

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہ (علمائے دیوبند) تکمیل اخلاق اور تزکیہ نفس کے لیے حسب سلاسل طریقت مشائخ کی بیعت وصحبت اور طریقت کے اصول وہدایات کی پابندی کو تجربۂ مفید اور ضروری سمجھتے ہیں ہیں، لیکن طریقت کو شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے جو سینہ بسینہ چلی آرہی ہے، بلکہ شریعت کے باطنی اور اخلاقی حصہ کو طریقت کہتے ہیں جو اصلاح قلب کا راستہ ہے، اور جسے شریعت نے احسان کہا ہے، اس لیے اس کے بنیادی اصول کو کتاب وسنت ہی سے ثابت شدہ جانتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں، مگر اس لائن کے بے اصول یا خلافِ اصول یا من گھڑت رواجی رسوم کو طریقت نہیں سمجھتے، بعض رسوم کے اختیار کرنے کو خلافِ سنت اور بعض کے ارتکاب کو بدعت سمجھ کر قابلِ رد سمجھتے ہیں۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص ۱۳۰)

حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت سہارنپوری، حضرت تھانوی اور حضرت مدنی وغیرہ سب مشائخ دیوبند نے باقاعدہ طور پر بیعت ہوکر سلوک طے کیا۔ اور اصلاح باطن ان حضرات کی دینی خدمات کا ایک اہم باب ہے۔ جیسا کہ ان حضرات کے حالات زندگی کے مطالعے سے واضح ہے۔

حضرت تقی فرماتے ہیں: تمام اکابر دیوبند کا مشترک رنگ یہ تھا کہ وہ حروف ونقوش کے کتابی علم کو اس وقت تک اہمیت نہیں دیتے تھے جب تک اس کے ساتھ انابت الی اللہ اور صلاح وتقوی نہ ہو۔ حکیم الامت حضرت تھانوی نے جب خانقاہ تھانہ بھون میں مدرسہ امداد العلوم قائم فرمایا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو اس کی اطلاع دی۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا: اچھا ہے بھائی، مگر خوشی تو جب ہوگی جب یہاں اللہ اللہ کرنے والے جمع ہوجاویں گے۔ حضرت مولانا محمد یسین صاحب قدس سرہ فرماتے تھے: ہم نے دار العلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر

مدرس سے لے کرادنی مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم اس زمانہ میں دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، اور درحقیقت یہی اس دارالعلوم کا طغرائے امتیاز تھا۔ (اکابر دیوبند کیا تھے؟ ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند): ص ۵۱، ۵۲، ملخصا، نومبر ۲۰۱۰م، ماہنامہ الرشید: ص ۱۴۵)

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: ہمارے طالب علمی اور بچپن کے زمانے میں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ نو دس سال رہ کر ایک طالب علم نے علم حاصل کر لیا، لیکن اکابر اس کو سند نہیں دیتے تھے، جب تک جماعت کے بزرگوں میں سے کسی کے پاس چھے مہینے رہ کر اپنی اصلاح نہ کرائے، اور صحبت یافتہ ہوکر اس کا رنگ نہ قبول کرلے۔ اس کے بغیر وہ سند نہیں دیتے تھے، کیونکہ صحبت کے بغیر (علم) محض ایک نمائش اور گرمی بازار اور گرمی محفل کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔ (خطبات حکیم الاسلام: ۱۲/ ۱۷۶، مرتب: مولانا محمد ادریس ہوشیار پوری، ت: مولانا ابن الحسن عباسی وغیرہ علماء، بیت السلام پبلشر، کراچی، ط: ۲۰۱۱م)

حضرت تھانوی فرماتے ہیں: جس زمانہ میں میں مدرسہ دیوبند پڑھتا تھا اس وقت کے حالات وواقعات یاد آ آ کر عجیب قلب کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ ایسا ہی زمانہ رہے گا۔ اس وقت بڑے بڑے اہل کمال کا اجتماع تھا۔ اور قریب قریب سب اپنے کو مٹائے ہوئے تھے اور فنا کیے ہوئے تھے۔ جب کبھی اتفاق سے ان حضرات کا اجتماع ہو جاتا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر بزرگ دوسرے کو اپنے سے بڑا سمجھتا ہے۔ بڑی ہی خیر کا مجمع تھا۔ یہی حالت آپس میں طلباء کی تھی۔ اور اساتذہ کے سامنے تو بولنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور ایک یہ زمانہ ہے کہ اس وقت سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔ اس وقت کھلم کھلا نظر آتا تھا کہ مدرسہ پر انوار کی بارش ہورہی ہے۔ اور یہ سب ان حضرات کی مقبولیت کی علامت تھی۔ اور ان حضرات کے تقوی اور طہارت کے ثمرات تھے۔ اور مدرسہ کی مقبولیت کا اس قدر جو اثر ساری دنیا پر ہوا یہ بھی ان ہی حضرات کی برکت تھی۔ مقبولیت پر یاد آیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے خواب میں دیکھا کہ جنت ہے اور اس میں ایک طرف چھپر کے مکان بنے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا اے اللہ! یہ کیسی جنت ہے جس میں چھپر ہیں۔ جس وقت صبح کو مدرسہ آیا مدرسہ کے چھپر نظر پڑے تو ویسے ہی چھپر تھے۔ یہ زمانہ مدرسہ کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ تب تعبیر سمجھ آئی کہ یہ مدرسہ کی مقبولیت دکھائی گئی ہے۔ اس زمانہ میں نہ یہ لمبی چوڑی تعمیر تھی، نہ اساتذہ تزک اور شان سے رہتے تھے۔ نہ طلباء کا کوئی فیشن تھا۔ پھٹے کپڑے، ٹوٹی ہوئی جوتیاں، یہ ان کا ظاہری حال تھا۔ نہ اس جدید قسم کے قواعد اور قانون تھے۔ نہ اتنے ممبر اور محراب تھے۔ کام جو کچھ ہوا سب کو معلوم ہے کہ کیسے کیسے باکمال لوگ فارغ ہوکر نکلے۔ اور اب

اس وقت سب کچھ ہے، اور اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ وہ جو ایک چیز تھی جس کو روح کہتے ہیں وہ نہیں رہی ۔(ملفوظات حکیم الامت:۱/ ۹۶، ۹۷، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط:۱۴۲۳ھ)

اپنی اصلاح باطن کا اہتمام کیے بغیر دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کے درپے ہونے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ یہ بات تجربے اور مشاہدے سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ جہاں شخصیت کی تعمیر اور فرد کی اصلاح کیے بغیر اسے دوسروں کی دینی خدمات میں مشغول کردیتے ہیں وہاں کیا کیا فسادات پیدا ہورہے ہیں!!! اور انکا حل کتنا دشوار ہورہا ہے!! مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالی کے الفاظ ملاحظہ ہوں: تجربہ ہے کہ دنیا میں جتنے فتنے پھیلے ہیں، جس سے مذاہب اور پارٹیاں بن جاتی ہیں، یہ زیادہ تر ان علماء سے پھیلے ہیں جو صحبت یافتہ نہیں ہوتے۔ فقط قرآن وحدیث کے الفاظ ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ اسلاف کا وہ رنگ ان کے قلوب میں نہیں ہوتا جو بزرگوں میں ہوا کرتا ہے، اس لیے ان سے فتنہ زیادہ پھیلتا ہے۔ جو عالم زیادہ صحبت یافتہ ہوگا، زیادہ دیانت قائم کیے ہوئے ہوگا اس سے فتنہ نہیں پھیلے گا۔ زیادہ فتنہ پرداز وہ ہوتے ہیں کہ ان کے پاس علم موجود ہوتا ہے، صحبت میسر نہیں ہوتی، اخلاق درست نہیں ہوتے، اخلاق کے اندر پختگی نہیں پیدا ہوتی، تو ان کے کلمات سے زیادہ تر بے ادبی اور گستاخی کا فتنہ پھیلتا جاتا ہے۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مصر، شام یا عراق (میں) ہوا، اول تو وہاں علم کی ہی کمی ہے ،لیکن اگر علم بھی ہے تو چونکہ صلحاء اور اہل اللہ کی صحبت میسر نہیں وہ علم وبال جان اور مار آستین ان کے حق میں بنا ہوا ہے ۔(خطبات حکیم الاسلام:۱۲/ ۱۷۶، ۱۷۷)

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے: میں نے بار بار یہ کہا ہے کہ پہلے اپنی ظاہری اور باطنی قوت کو دیکھ لو۔ اس کے بعد ایثار کرو اور دوسروں کے کاموں میں پڑو، مگر اپنا نقصان کرکے اور دین کو برباد کرکے دوسروں کے کاموں میں لگنا اور اصلاح غیر کے درپے ہونا یہ حضرات صحابہ سے کہاں ثابت ہے؟ اور اس پر کہاں مدح کی گئی ہے؟ اس آیت (**والذین تبوئوا الدار والایمان من قبلھم ......**) میں اللہ تعالی نے حضرات صحابہ کی اول تعریف اس پر کی ہے کہ وہ اپنے نفس کی تکمیل کرچکے ہیں اور ایمان کو اپنے دلوں میں جما چکے ہیں اور نفس کو حرص وغیرہ سے پاک کرچکے ہیں۔ اس کے بعد ایثار پر مدح کی گئی ہے۔ اس سے خود میرے بیان کی تائید ہورہی ہے کہ اصلاح نفس اصلاح غیر سے مقدم ہے اور یہ کہ ایثار کی اسی کو اجازت ہے جو اپنی اصلاح سے فراغت کرچکا ہو۔ اب وہ مولانا صاحبان غور کرلیں جو اصلاح غیر کے درپے ہیں، کیا وہ اپنی اصلاح وتکمیل سے فارغ ہوگئے ہیں؟ اگر وہ سچ بولیں گے تو ضرور یہ کہیں گے کہ فراغت تو کہاں ابھی تو اپنی اصلاح کی ابتداء بھی نہیں ہوئی۔ میں اسی حالت کو مرض کہہ رہا ہوں اور اسی سے منع کررہا ہوں۔(خطبات حکیم الامت : ۲۵/ ۱۷۶، ت: صوفی اقبال، مولانا زاہد محمود، ادارہ تالیفات اشرفیہ

،ملتان، ط:۱۴۲۹ھ)

۵: دین کے دفاع کی طرف خصوصی توجہ

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: درالعلوم کی جماعت اپنے مسالک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کیلیے سینہ سپر رہی۔ خواہ وہ فتنہ نقل وروایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیاد سے اٹھا۔ اس جماعت نے ہمیشہ اعلائے کلمۃ اللہ اورامر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب اوراسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اٹھایا۔ (ماہنامہ الرشید: ص۱۱۵تا۱۵۷ملخصا)

ہندوستان پر انگریزوں نے تسلط جمانے کے بعد یہاں پر عیسائی مذہب کی تبلیغ کی کوششیں تیز کردیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ ایک بڑا جلسہ رکھا گیا جس میں ہندو پنڈتوں کو دعوت دی گئی، عیسائی پادری بلوائے گئے، اور مسلمان علماء کوبھی دعوت دی گئی۔ غرض یہ تھی کہ اگر جلسے میں اسلام پر اعتراض کر کے مسلمان علماء کو چپ کرادیا گیا تو مسلمانوں کوان کے دین سے ہٹانا آسان ہوگا۔ چنانچہ ان میں سے پہلا جلسہ میلہ خدا شناسی ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۶۷م کو شاہجہانپور میں ہوا۔

پہلے میلہ خداشناسی میں حضرت قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے جو تقریر فرمائی اس کے بارے میں پادری اینک نے کہا:

کیا پوچھتے ہو؟ ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ اور بہت سے علمائے اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا۔ پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک پتلا دبلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں۔ ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔ اور پھر یہ کہا کہ تقدیر کے مسئلہ کو پادری جب چھیڑا کرتے ہیں جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں رہتی۔ پادری نولس صاحب نے لاچار ہوکر یہ باتیں شروع کی تھیں، پر اس شخص نے ایسا ان سب کو اڑایا کہ پتا نہ لگنے دیا۔ (واقعہ میلہ خداشناسی: ص۴۰، مطبع مجتبائی، دہلی، ط:۱۳۱۲ھ)

میلہ برخاست ہوا۔ باہر آتے ہی مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے۔ مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی سو تھی، مگر ہنود بھی بہت خوش تھے۔ آپس میں کہتے تھے نیلی لنگی والے مولوی (حضرت نانوتوی) نے پادریوں کو خوب مات دی۔ (مصدر سابق: ص۳۷) حضرت نانوتوی قدس سرہ کے مناظروں کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: سوانح قاسمی: ۲/ ۳۵۸ تا ۴۶۳، مولانا مناظر احسن گیلانی، بانی دار العلوم دیوبند: ص۲۳ تا ۳۸، مولانا سرفراز خاں صفدر)

اہل زیغ وضلال کے شبہات واعتراضات کے مدلل اور شافی جواب دینا، دیگر حضرات اکابرین دیوبند کی تحریر وتقریر کا بھی ایک اہم موضوع رہا ہے۔اور یہ درحقیقت ارشاد خداوندی وجادلہم بالتی ہی احسن کا عملی مظاہرہ ہے۔

دین کے دفاع میں یہ بھی داخل ہے کہ دین کی صحیح تشریحات سے متصادم جو بھی تحریر اور تقریر ہو اسے صاف طور پر ظاہر کردیا جائے۔اس کا ایک واقعہ دیکھیے! مولانا محمد میاں صدیقی لکھتے ہیں: سید صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی)جب بھی لاہور تشریف لاتے، جامعہ اشرفیہ کے مہمان خانے میں ٹھہرتے۔والد صاحب قبلہ (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) کے ساتھ علمی گفتگو رہتی۔علم کلام پر سید صاحب نے ایک کتاب لکھی۔اس کا مسودہ لے کرآئے۔کئی روز لاہور قیام رہا۔مسودہ کے اکثر حصے والد صاحب کو سنائے۔والد صاحب نے اس کے بعض حصوں پر تنقید کی اور فرمایا کہ سید صاحب! آپ کی یہ تحریر مسلک اہل سنت والجماعت سے ہٹی ہوئی ہے۔سید صاحب اس وقت خاموش رہے۔تین چار روز بعد کراچی جانے لگے تو والد صاحب اور مولانا خیر محمد جالندھری سید صاحب کو رخصت کرنے سڑک تک آئے۔(ناچیز راقم بھی موجود تھا)۔سید صاحب جب گاڑی میں سوار ہونے لگے تو مسکرا کر فرمایا: میں نے علم کلام پر جو مسودہ مرتب کیا تھا اب اسے چھپوانے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے، کچھ اللہ میاں کے ڈر سے، اور کچھ مولوی ادریس کے ڈر سے۔اور پھر واقعی سید صاحب نے وہ مسودہ طبع نہیں کرایا۔(تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی :ص ۲۶۷، ۲۶۸، مولانا محمد میاں صدیقی، مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ، لاہور، ط: اول ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۷م)

۶: تدریس وافتاء

علم دین میں گہرائی اور گیرائی کے لیے ایک طویل عرصے تک علمی مشغلے میں انہماک کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کی عمدہ صورت تدریس اور افتا میں مشغول ہونا ہے۔ان سے ایک طرف پڑھانیوالے اور فتوی بتانے والے کو علمی وسعت اور پختگی حاصل ہوتی ہے، اور دوسری طرف دین کی صحیح سمجھ بوجھ رکھنے والی جماعت تیار ہوتی ہے، اور عامۃ المسلمین تک دین کے احکام پہنچتے ہیں۔مشائخ دیوبند کو تدریس وافتا کا خاص ذوق رہا ہے۔

دار العلوم دیوبند میں ممتاز علمی اور عملی خوبیوں والے اساتذہ رکرام اپنے اپنے وقت کے صدر مدرس رہے ہیں۔چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا سید احمد دہلوی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، اور حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ تعالی اپنے اپنے وقت کے صدر مدرس رہے ہیں۔اور مفتی کے طور پر خدمات سرانجام دینے والے حضرات میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا محمد اعزاز علی، مولانا ریاض الدین، مفتی محمد شفیع ، مولانا محمد سہول، مولانا محمد کفایت اللہ میرٹھی، مولانا محمد فاروق امبیٹھوی، مولانا مہدی حسن شاہ جہانپوری وغیرہ حضرات

شامل ہیں۔(ماخذہ: تاریخ دارالعلوم دیوبند:ص ۹۷-۱۰۰ ملخصا)

اساتذہ دیوبند کی درسی امالی سے ان حضرات کی علمی جامعیت اور تحقیق کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔اور فقہی مہارت کے لیے فتاوی رشیدیہ، فتاوی خلیلیہ، عزیز الفتاوی، امداد الفتاوی، امداد الاحکام، فتاوی دارالعلوم دیوبند، جواہر الفقہ، اور امداد المفتین وغیرہ کتب کافی ثبوت ہیں۔

مولوی ظفر احمد صاحب نے ایک مرتبہ (حضرت سہارنپوری) سے عرض کیا کہ حضرت فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرمائیں۔فرمایا مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتاء آنے کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں۔اس سے کام نہیں چلتا۔اور جواب میں بہت غلطی ہوجاتی ہے۔کیونکہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھکر جواب لکھ دیتے ہیں، حالانکہ دوسرے مقام میں اس مسئلہ کے اندر تفصیل معلوم ہوتی ہے جس سے اس واقعہ مسئولہ کا حکم بدل جاتا ہے۔پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے شامی اور بدائع کو بالاستیعاب دیکھنا چاہیے۔ہمارے حضرت گنگوہی نے شامی کو کئی بار بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا ہے۔حقیقت میں بدائع عجیب کتاب ہے۔جزئیات تو زیادہ شامی میں ہیں، مگر اصول اور فقہ کی لم زیادہ بدائع میں، کہ اس سے مناسبت ہوجائے تو فقہ میں طبیعت چلنے لگے۔(تذکرۃ الخلیل:ص ۲۹۴ ملخصا، مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی، مکتبۃ الشیخ، کراچی، ط: سنہ ندارد)

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے سبق پڑھانے کی کیفیت حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ تعالی کی زبانی ملاحظہ ہو: اس زمانہ میں پڑھانا اکثر تھا، سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے، اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی نے سنے، نہ سمجھے۔اور عجائب غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے، جس سے تطبق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ وبن تلک ہوجاتی تھی۔(حالات طیب:ص ۵۰، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، ت: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، یوپی انڈیا، ط: ۱۴۳۵ھ)۔

اور فرماتے ہیں: مولوی صاحب سے پڑھنا نہایت ہی دشوار تھا، جو شخص طباع ہو اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو تب مولوی صاحب کی بات سمجھ سکتا تھا۔ہر چند مولوی صاحب نہایت ہندی کی چندی کرکر بیان فرماتے، مگر پھر مشکل بات مشکل ہی ہوتی ہے۔(مصدر سابق:ص ۵۲)

(حضرت) مولانا محمود حسن (شیخ الہند) فرماتے تھے کہ میں نے اس کا التزام کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف دیکھ کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس (سبق) میں حاضر ہوتا۔اور وہ باتیں پوچھتا جو حضرت شاہ صاحب کی کتب میں مشکل ہوتی تھیں، لیکن شاہ صاحب کی کتب میں جو انتہائی جواب ہوتا تھا وہ حضرت نانوتوی اول ہی دفعہ میں فرمادیتے تھے۔بارہا اس کا تجربہ کیا! (ارواح ثلاثہ:ص ۲۰۵، مکتبۃ الحسن، لاہور، ط: سنہ ندارد)

حضرت گنگوہی قدس سرہ کی تحدیث (حدیث پڑھانے) میں یہ خاص برکت تھی کہ مضمون حدیث سن کر اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ خاص روحی اثر اس کا پتہ دے رہا تھا کہ یہ تحدیث کتابی نہیں ہے، بلکہ حضرت قدس سرہ کے چشمان دل صفا منزل کے سامنے ایک آئینہ لگا ہوا ہے جس میں صاحب حدیث علیہ السلام کے انوار کا عکس پڑتا ہے اور اس انعکاسی تجلی سے حضرت اپنے طلبہ کو متمتع فرمار ہے ہیں۔ آپ کی تدریس میں ایسا محویت کا عالم ہوتا تھا کہ بے اختیار دل خواہش کرتا کہ کاش تقریر کا سلسلہ دیر تک ختم نہ ہو۔ حضرت کی تقریر ایسی سلیس عام فہم ہوتی کہ پاس بیٹھے ہوئے عامی لوگوں کو بھی حرفا حرفا سمجھ میں آتی اور دل کے کواڑ کھولتی چلی جاتی تھی۔ اسناد حدیث کے متعلق پوری تحقیق فرماتے تھے۔ اختلافات احادیث اور تعارض کے متعلق مختصر مگر جامع تطبیق فرماتے تھے کہ ذرہ بھر گلجھٹ اور حبہ برابر الجھن باقی نہ رہتی تھی۔ آپکی تقریر میں ایک عجیب کرامت تھی کہ وسیع تقریر اور بلیغ تحقیق کی طرف دیکھا جاتا تو خیال ہوتا تھا کہ سبق بہت کم ہوا، لیکن اوراق وصفحات شمار کیے جاتے تو حیرت ہوتی کہ اس قدر سبق کیونکر ہو گیا؟ آپ کی تقریر کے بعد حواشی بالکل بے کار معلوم ہوتے تھے اور یوں خیال ہوتا تھا کہ جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابی نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہوگا تو ہمارے حضرت وہیں کسی جگہ کھڑے سن رہے ہوں گے۔ (تذکرۃ الرشید: ۱/ ۸۹، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء، حضرت گنگوہی قدس سرہ صحاح ستہ کا دورہ حدیث شریف اکیلے خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ تفصیل کے لیے تذکرۃ الرشید، عنوان: تدریس ودورہ حدیث کی مراجعت فرمائیں)۔

۷: دعوت وارشاد

مولانا احمد حسن صاحب بڑے معقولی تھے اور کسی کو اس میدان میں اپنا ہم سر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک دن حضرت نانوتوی قدس سرہ کا وعظ ہوا اور اتفاق سے سامنے وہی تھے اور مخاطب بن گئے۔ اور معقولات ہی کے مسائل کا رد شروع ہوا۔ وعظ کے بعد انھوں نے کہا اللہ اکبر! یہ باتیں کسی انسانی دماغ کی نہیں ہوسکتیں۔ یہ تو خدا ہی کی باتیں ہیں۔ مجھ پر تو یہ اثر ہوا ہے کہ خودی مٹ رہی ہے۔ اس مجلس میں حضرت سے بیعت کی درخواست کی۔ فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب کی طرف سے بیعت کرتا ہوں، جب آپ وہاں جائیں تو پھر وہاں تجدید بیعت کرلیں۔ چنانچہ جب مولانا گئے تو حضرت حاجی صاحب سے تجدید بیعت کر لی۔

حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کا ایک وعظ سہارنپور میں ہوا، جس میں مولانا محمد مظہر نانوتوی بھی شریک تھے اور ختم وعظ پر فرمانے لگے کہ بھلا ان کے ہوتے ہوئے کوئی واعظ وعظ کہہ کر کیا ایسی تیسی کھائے گا! یہ علوم کہاں سے لائے گا؟ یہ اثر کہاں سے آئے گا؟ (ارواح ثلاثہ: ص ۲۱۱، ۲۱۲)

مدرسہ دیوبند کے ایک سالانہ جلسے میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کے وعظ کا واقعہ ملاحظہ ہو: جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں (حضرت گنگوہی قدس سرہ نے) وعظ فرمایا۔

وعظ کیا تھا وان من البیان لسحرا کا مصداق تھا، اور بیان کیا تھا محبت الٰہی کا دریائے مواج اور قلزم متلاطم تھا، جس نے اس کنارے سے لے کر اس کنارے تک ہر صغیر و کبیر کی حالت کو دگرگوں کر دیا تھا۔ آپ حدیث کی کتاب ہاتھ میں لے کر منبر پر بیٹھے اور کیف ما اتفق اسے کھول کر جو حدیث نظر پڑی اس کو پڑھ کر ترجمہ فرمانے لگے۔ آپ کے سارے وعظ میں حدیث نبوی کا سادہ ترجمہ اور یہی نماز روزے کے مسائل تھے جو معمولی پڑھے لکھے بھی بیان کر دیتے ہیں، مگر خدا جانے وہ غیبی تاثیر کیا تھی جس نے سارے جلسے کو ساکت و صامت اور مبہوت و سرنگوں بنا رکھا تھا۔ ہر شخص اس قلبی فیضان سے متاثر تھا اور مسجد کی دیواریں تک مست و سرشار نظر آتی تھیں۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ نے اس وعظ کی چشم دید کیفیت کو سالانہ روئیداد میں مختصر الفاظ کے ساتھ اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ:......وعظ کیا تھا گویا سامعین کو مئے محبتِ الٰہی کے خم کے خم پلا دیے۔ در و دیوار تک مست تھے۔ اور عجیب کیفیت ظاہر تھی کہ کہیں دیکھی نہ سنی۔ اللہ اللہ اس کے خاص بندوں کے سیدھے سیدھے الفاظ اور سادہ بیان اور ڈھیلی ڈھیلی زبان میں کیا کیا تاثیرات ہیں کہ بشر کیا شجر و حجر بھی مان جاتے ہیں۔ مولانا نے کوئی دقیق مضامین علمیہ بیان نہیں فرمائے۔ یہی وضو اور نماز کے مسائل بیان کیے۔ اور اخلاص کے بیان میں کسی تقریب سے ایک دفعہ بآواز بلند اللہ کہا۔ معلوم نہیں کس دل اور کیسے گداز سے اللہ کا نام لیا کہ تمام مجلس وعظ لوٹ گئی۔ اور آہ وزاری کی آواز سے مسجد گونج اٹھی۔ ہر شخص اپنے حال میں مبتلا تھا۔ اس وقت بعض اشخاص نے مولوی صاحب کو دیکھا کہ کمال وقار سے منبر پر خاموش بیٹھے ہیں اور اہل مجلس کی طرف متوجہ ہیں۔ یقین ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ایسے متوجہ نہ ہوتے تو اہل مجلس کو دیر تک افاقہ نہ ہوتا، مگر اللہ رے حوصلہ کہ خود ویسے ہی مستقل رہے۔ سینہ میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ ہی رہا۔ انتہیٰ

سنا ہے کہ وعظ سے پہلے مجمع میں واعظین کی تقاریر اور تاثیرات کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ بعض وعظ کہنے والے بیان وتقریر کا اس درجہ ملکہ رکھتے ہیں کہ حاضرین کا ہنسا دینا اور رلا دینا گویا ان کے اختیار میں ہے کہ جب چاہا ہنسا دیا اور جس وقت رنگ بدلنا چاہا تو رلا دیا۔ حضرت امام ربانی نے بھی گفتگو سنی اور بات ٹالنے کے لیے یوں ارشاد فرما کر خاموش ہو گئے تھے کہ ہاں اللہ کے بندوں کے نزدیک یہ کوئی چیز نہیں گنی جاتی۔ رلانا اور ہنسانا بات ہی کیا ہے؟ اخلاص کے ساتھ اللہ کا نام بھی نکلے تو اس پر مخلوق رونے لگے۔ چنانچہ چند ہی ساعات کے بعد وعظ میں وہ مضمون جو علم الیقین تھا، عین الیقین بن گیا۔ (تذکرۃ الرشید: ۱/۲۵۰، ۲۵۱ ملخصا) **(باقی آئندہ)**

مقالات ومضامین

مدرسہ دیوبند کا فکری اور عملی منہج

(......آخری قسط......)

مولانا مفتی طارق محمود

۸:تصنیف وتالیف

کتابی شکل میں دین کی تشریحات کو محفوظ کرنا بھی دینی خدمات کا ایک اہم شعبہ ہے۔دین کو اصلی حالت میں باقی رکھنے میں تصنیف وتالیف کا کلیدی کردار ہے۔یہی وجہ ہے کہ علمائے امت نے ہر دور میں اس دینی ضرورت کو بہترین طریقے سے پورا کیا ہے۔علمائے دیوبند نے بھی اس روایت کا تسلسل اعلیٰ ترین معیار پر باقی رکھا ہے۔اس بارے میں محترم جناب سید مشتاق علی شاہ نے ایک مختصر فہرست مرتب کی ہے۔اس رسالے کا نام ہے: علمائے اہل سنت کی تصنیفی خدمات کی ایک جھلک۔یہ رسالہ مکتبہ فاروقیہ، گوبند گڑھ گوجرانوالہ سے مطبوع ہے۔حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی عارفی نے فہرست تالیفات حکیم الامت کے نام سے ایک ضخیم جلد مرتب فرمائی ہے۔جو مکتبہ دار العلوکراچی سے ۱۴۰۷ھ میں طبع ہوئی تھی۔مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تاریخ دارالعلوم دیوبند ص۵۱،۵۲ پر مشہور علماء دیوبند کا تصنیفی رنگ ذکر فرمایا ہے۔

حضرت نانوتوی کی تالیفات کا مجموعہ مقالات حجۃ الاسلام کے نام سے ۱۷جلدوں میں،اور حضرت تھانوی کی تصانیف کا ایک مجموعہ مقالات حکیم الامت کے نام سے ۳۴ جلدوں میں حال ہی میں ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان سے طبع ہوئے ہیں۔حضرت گنگوہی کے رسائل کا ایک مجموعہ تالیفات رشیدیہ کے نام سے ادارہ اسلامیات لاہور سے مطبوع ہے۔حضرت انور شاہ کشمیری کے رسائل مجموعۃ رسائل الکشمیری کے نام سے ۴ جلدوں میں ادارۃ القرآن کراچی سے مطبوع ہیں۔

۹: سیاسیات میں شرکت

مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: علمائے دیوبند آج کی غیر شرعی سیاست کے ہجوم میں بھی ملکی معاملات اور سیاسیات کلیۃً بیگانہ یا الگ تھلگ نہیں رہے۔بلکہ شرعی حدود میں رہ کر تا بحد امکان اس میں بھی حصہ لیا،مگر مدافعانہ انداز میں۔۱۸۵۷ء میں لوجہ اللہ الگ استخلاص وطن کے لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ بانی دارالعلوم دیوبند نے جنگِ آزادی میں قائدانہ حصہ لیا۔توپ وتفنگ سے انگریزوں کا

مقابلہ کیا اور بازیافت وطن کی ایک مثال قائم کر دی۔ خلافتِ ترکیہ پر روسی یلغار کے وقت حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خلافت کی بقاء اور تحفظ پر مسلمانوں کی آواز کو متحد بنایا اور ترکوں کی مالی امداد کے لیے نہ صرف چندہ کر کے ہزار ہا روپیہ ہی ترکوں کی امداد کے لیے بھجوایا، بلکہ خود اپنے گھر بار کا اثاثہ بھی اسی امداد میں لگا دیا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد حقوقِ طلبی کے لیے جب کانگریس قائم ہوئی تو سب سے پہلے حضرت قطب وقت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سرپرست ثانی دارالعلوم دیوبند نے اس میں شرکت کا فتوٰی دیا۔

برطانیہ کی سازش سے وقت خلافتِ ترکی پر زوال آیا تو علمائے دیوبند باوجود اپنی تدریسی مشاغل کے پوری ہمت و پامردی کے ساتھ احتجاج اور اس کے جلسوں کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ریشمی رومال کی تاریخ سے کون ناواقف ہے۔ جس کے بانی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر المدرسین دارالعلوم الدیوبند قدس سرہ تھے، جنھوں نے اس سلسلے میں مالٹا کی قید و بند کے مصائب پانچ برس تک جھیلے۔

آزادی وطن کی تحریک اٹھی تو انھی علمائے دیوبند نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کی قیادت میں جمعیۃ العلماء ہند قائم کر کے شانہ بشانہ جنگِ آزادی لڑی اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے باوجود مشاغل تدریس دارالعلوم کے برسہا برس اس کی قیادت کی اور ملک کو آزاد کرایا۔

مسلم لیگ نے پاکستان کی تحریک اٹھائی اور ایک بڑے طبقہ علماء نے ابتداء اس کی مخالفت کی، لیکن یہ محسوس کر کے کہ پاکستان بن جانا یقینی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اسلامی آئین کا خطہ ثابت ہو، حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی قیادت بھی کی تا کہ پاکستان میں دینی آواز پست ہونے نہ پائے۔ ہندوستان کو آزادی مل جانے کے بعد مسلمانوں کے حقوق کی نگرانی وحفاظت میں جمعیۃ العلماء ہند نے جو جدوجہد کی اسے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ (علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ص۱۷۴، ۱۷۵)

قائداعظم کی مجلس میں ایک دفعہ یہ گفتگو آئی کہ کانگریس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سن کر قائداعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم وتقدس وتقوی اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم وتقدس وتقوی دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں جو چھوٹے سے قصبے میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے، اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں پرواہ نہیں۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی: ص۷۸، ۷۹ ملخصاً منشی عبدا لرحمٰن خان، ادارہ اسلامیات، لاہور، ط: ۱۹۹۲م، یہ کتاب اپنے موضوع پر بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز دیکھیے: قائداعظم کا مذہب اور عقیدہ: منشی

عبدالرحمٰن خان، کاروان ادب، ملتان، ط:اول:۱۹۸۶م)

مولانا عبد الماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:۱۹۲۸م میں جب پہلی بار (حضرت تھانوی کی خدمت میں) حاضری ہوئی تو حضرت نے دار السلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ (ماہنامہ الحسن: حضرت تھانوی نمبر:۱/۱۰۷، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ/ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۷م، جامعہ اشرفیہ، لاہور) اس کے اڑھائی سال بعد اقبال مرحوم نے اپنے خطبہ الہ آباد میں پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ (مصدر سابق:۱/۱۰۷، پاکستان کا ابتدائی پانچ نکاتی خاکہ: منشی عبدالرحمٰن خان)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو ملک کی سب سے بڑی مقتدر ہستی یعنی قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے علمائے ربانی کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو بخشا۔ جنھوں نے اپنے متبرک ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا آزاد فضا میں پرچم لہرا کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا فتتاح کیا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کا جو نقشہ جون ۱۹۲۸م کو پیش کیا تھا، اس کی رسم افتتاح بھی دربار اشرفیہ کے خدام کے حصہ میں آئی۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی:ص۲۷۲، ملخصا)

پاکستان بننے کے بعد ایک صاحب نے مجلس میں (حضرت مدنی سے) پوچھا کہ حضرت پاکستان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت سے فرمایا: مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے۔ (حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے حیرت انگیز واقعات:ص۱۷۸، مولانا ابو الحسن بارہ بنکوی، مکتبۃ الحسن، لاہور، ط:۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹م)

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہییں، اور اس کے لیے عملی اقدام اٹھانا چاہیے۔ مجلس احرار کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے اور خلاف شرع کام سے اجتناب۔ اصلاح احوال کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر الدین النصیحۃ پر عمل ہونا چاہیے۔ (حیات امیر شریعت:ص۳۱۲، جانباز مرزا، چٹان پریس، لاہور، ط:۱۹۷۰م، اور دیکھیے:ص۳۱۱-۳۲۷)

۱۰:استغناء اور توکل

حضرت نانوتوی قدس سرہ نے دارالعلوم دیوبند کے آٹھ بنیادی اصول تحریر فرمائے۔ اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ تعالی نے آٹھ انتظامی اصول تحریر فرمائے۔ آٹھ بنیادی اصولوں میں سے آخری تین اصول ملاحظہ ہوں:

۶: اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی۔ اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

۷: سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸: تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند: ص۱۴-۷ املخصا)

مولانا محمد علی جوہر جب تحریک خلافت کے موقع پر دیوبند تشریف لائے، دارالعلوم میں پہنچے اور یہ اصول ہشتگانہ حضرت (نانوتوی) ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ان کے سامنے پیش کیے گئے تو مولانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور فرمایا: ان اصولوں کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو خزانہ غیب اور مخزن معرفت سے نکلے ہوئے ہیں۔ حیرت ہے کہ جن نتائج تک ہم سو برس میں دھکے کھا کر پہنچے ہیں، یہ بزرگ سو برس پہلے ہی ان نتائج تک پہنچ چکے تھے۔ (ماہنامہ الرشید: ص۱۳۸)

نواب کلب علی خان نے اپنے خاص سیکرٹری کو اور وزیر عثمان کو حضرت (نانوتوی) کی خدمت میں بھیجا کہ میں حضرت کا میں مشتاق ہوں، مجھ سے مل لیں۔ حضرت نے اول تو اعذار شروع کیے کہ میں غریب ہوں دیہات کا رہنے والا ہوں، آداب امراء سے غیر واقف ہوں۔ لیکن وزیر نے اپنی شستہ اور سجل تقریر میں عرض کیا کہ حضرت نواب صاحب تو خود حضرت کا ادب کریں گے۔ حضرت تمام آداب سے مستثنی رہیں گے۔ تب آخر میں مولانا نے ارشاد فرمایا کہ پھر نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں۔ میں تو ان کی زیارت کا مشتاق نہیں ہوں۔ اگر ان کو اشتیاق ہے تو خود مجھ سے ملنے آئیں، ان کے پیروں میں مہندی تو نہیں لگی ہے۔ بہر حال نہ جانا تھا نہ گئے۔ اور امراء کے مقابلہ میں حضرت کا یہی طرز عمل رہا ہے۔ نواب محمود علی خان صاحب رئیس چھتاری ساری عمر اسی تمنا میں رہے کہ کسی طرح مل لوں، مگر حضرت نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ اگر حضرت کے علی گڑھ آنے کی خبر سن کر وہ علی گڑھ آئے تو

حضرت جھٹ سے خورجہ تشریف لے گئے ۔ جو خورجہ گئے تو حضرت میرٹھ آ گئے ۔اسی طرح بغیر نواب صاحب کی درخواست مانے ہوئے رامپور واپس تشریف لے آئے ۔(ارواح ثلاثہ:ص ۲۲۸،۲۲۹) حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی نواب حیدرآباد دکن سے ملاقات کا دلچسپ واقعہ دیکھیے :ملفوظات حکیم الامت :۲۷۲/۵-۲۷۵،ادارہ تالیفات اشرفیہ،ملتان،ط:۱۴۲۹ھ)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:علماء اور مشائخ کو چاہیے کہ وہ ایسا طرز نہ اختیار کریں کہ جس سے اہل دین اور دین کی بے وقعتی لوگوں کی نظروں میں پیدا ہو۔اور زیادہ تر اہل مدارس کی بدولت عوام خراب ہوئے ہیں۔اہل مدارس مدرسوں کی وجہ سے زیادہ چاپلوسی کرتے ہیں۔سمجھتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا تو یہ چندہ نہ دیں گے۔میں کہتا ہوں یہ خیال ہی غلط ہے کہ چندہ نہ دیں گے۔دیں گے،ضرور دیں گے۔اس لیے کہ یہ تو حق تعالی کے قبضہ میں ہے۔اگر خلوص ہے پھر فلوس تو تمھارے جوتوں سے لپٹتے پھریں گے۔اور اگر دے ہی دیا مگر تم کو اور دین کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھا تو ایسے چندوں کو لے کر کیا کرو گے؟ کیونکہ جو مقصود تھا مدارس کا کہ دین اور اہل دین کی قلوب میں عظمت ہو،وقعت ہو،تبلیغ کا اثر ہو،جب وہ حاصل نہ ہوا تو مدارس ہی کو لے کر کیا چاٹو گے؟ مجھ کو تو ہمیشہ اس کا خیال رہتا ہے کہ دین کی اور اہل دین کی بے عظمتی اور بے وقعتی نہ ہو،اور یہ کہ ہمیشہ مصالح دنیوی پر مصالح دینی مقدم رہیں۔(ملفوظات حکیم الامت :۱۴۶/۶،ادارہ تالیفات اشرفیہ،ملتان،ط:۱۴۲۹ھ) اور فرماتے ہیں:غرض نہ تکبر ہو،نہ تذلل ہو۔اور یہ اعتدال پیدا ہوسکتا ہے کسی کامل کی صحبت سے۔اس کی جوتیاں سیدھی کرنے سے۔بلکہ اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جوتیاں کھانے سے۔اور یہ بھی بتلائے دیتا ہوں کہ وہ جوتیاں مارے گا نہیں،مگر تم کو اس کے لیے تیار ہو کر آنا چاہیے۔(مصدر سابق:۱۶۱/۶)

۱۱:متفرق تعلیمی خصوصیات

(الف) کتاب وار نظام تعلیم:

مدارس عربیہ اور بالخصوص دارالعلوم کے نظام تعلیم میں ایک خصوصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔وہ یہ کہ جماعت وار نظام تعلیم یعنی درجہ بندی جو عام طور پر علمی درس گاہوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے اس کے بجائے کتاب وار نظام تعلیم اختیار کیا گیا ہے۔یعنی ہمارے مدارس میں جماعت بندی (کلاس سسٹم)نہیں ہے، بلکہ طلبا کو تعلیمی لحاظ سے کتابوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔اگر یہ بتلانا ہو کہ طالب علم تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کس دور سے گزر رہا ہے تو جماعت کا نام لینے کے بجائے یہ کہا جائے گا کہ فلاں فلاں کتاب پڑھ چکا ہے۔سالانہ تعلیمی ترقی میں بھی درجات کے بجائے کتابوں کا ہی لحاظ رکھا جاتا ہے۔سالانہ امتحان میں اگر طالب علم ایک یا دو کتابوں میں فیل ہو

جاتا ہے، اور بقیہ میں پاس ہو جاتا ہے،تو وہ کتابیں جن میں طالب علم فیل ہوا ہے ان کتابوں کی سالانہ ترقی میں حارج نہیں ہوتیں جن میں اس نے کامیابی حاصل کر لی ہو۔جن کتابوں میں طالب علم ناکام ہوتا ہے سال آئندہ میں انھی کتابوں کا اعادہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک یا دو کتابوں کی ناکامی کے باعث کامیاب شدہ کتابوں کے اعادے پر مجبور کیا جائے۔اس کا نتیجہ جہاں ایک طرف یہ نکلتا ہے کہ طالب علم میں بد دلی پیدا ہونے نہیں پاتی، وہیں دوسری جانب اس کی مدت اور مصارف تعلیم میں بھی فی الجملہ وقت اور روپے کی کفایت ہو جاتی ہے۔(ماہنامہ الرشید :ص۱۸۹)

(ب)طریق درس:

دارلعلوم میں لیکچروں کے بجائے تعلیم کا یہ طریقہ رائج ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں کے سامنے کتاب ہوتی ہے۔استاد کا فرض ہے کہ جب طالب علم سبق کی عبارت پڑھ چکے تو استاد فنی حیثیت سے اس پر ایک جامع تقریر کرے جس میں متعلقہ مسائل کے ہر پہلو پر روشنی ڈالے اور آخر میں اپنی تقریر کو کتاب کی عبارت پر منطبق کر کے طالب علم کو مطمئن کر دے۔طلباء درس میں بالکل آزاد ہوتے ہیں اور وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں کہ جب تک سبق کو پوری طرح سمجھ نہ لیں، اور جتنے اعتراضات اس سبق کے بارے میں ہوں ان کا تسلی بخش جواب استاد سے نہ سن لیں اسے آگے نہ بڑھنے دیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف طالب علم مطالعہ کر کے اور پوری تیاری کر کے درس میں آ کر بیٹھتے ہیں اور دوسری طرف استاد بھی پوری محنت اور تیاری کے ساتھ پڑھانے پر مجبور ہوتا ہے۔موجودہ طریق تعلیم کے مطابق دارلعلوم میں یہ طریقہ رائج نہیں ہے کہ استاد آئے مضمون پر لیکچر دے دے اور طلباء لیکچر نوٹ کر لیں۔(مصدر سابق:ص۱۹۰)

(ج) امتحان:

دارلعلوم میں امتحان کے سلسلے میں جو قواعد مروج ہیں وہ فی الجملہ یونیورسٹیوں کے امتحانات سے زیادہ سخت ہیں۔دارلعلوم کے امتحان میں ہر کتاب کے متعلق تین سوال ہوتے ہیں اور ہر پرچے میں تینوں کا حل اس لیے لازم ہوتا ہے کہ تینوں کے نمبر مشترکہ ہوتے ہیں۔اگر ایک سوال بھی چھوڑ دیا جائے تو طالب علم فیل ہو جاتا ہے۔کامیابی کے نمبروں کا معیار ۸۰ فیصد رکھا گیا ہے جو یونیورسٹیوں کے ۳۳ فیصد سے کہیں زیادہ ہے۔(مصدر سابق:ص۱۹۱)

(د)مادری زبان میں تعلیم:

دارلعلوم(دیوبند) کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں درس وتعلیم کی زبان اردو قرار دی گئی

ہے۔کتابیں عربی زبان میں ہیں مگر اساتذہ کی تقریریں اردو میں ہوتی ہیں۔علوم وفنون کی تعلیم میں جو اہمیت مادری زبان کو حاصل ہے،اس کو یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں بڑی مدت کے بعد سمجھا جا سکا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ آتے ہیں اور حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں،وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہیں۔مگر انگریزی اقتدار کے غلبے نے قوم کے دماغوں کو اس قدر متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ عرصے تک اس حقیقت کا سراغ نہ پا سکی۔(مصدر سابق:ص۱۹۱،۱۹۲)

(ہ): خالص دینی تعلیم:

حضرت تھانوی قدس سرہ ایک مثالی دینی مدرسے کی خصوصیات کے بارے میں فرماتے ہیں: وہ خالص مذہبی مدرسہ ہو،یعنی دنیا کا نہ اس میں غلبہ ہو،نہ خلط ہو۔کیونکہ اگر غلبہ ہے تو احکام و آثار میں حکما وقوعا اعتبار غالب کا ہوتا ہے۔اس لیے وہ دنیوی مدرسہ ہوگا اور گفتگو ہے مذہبی دارالعلوم میں۔اس لیے دنیوی مدرسہ مذہبی دارالعلوم نہیں ہوسکتا۔اور اگر دنیا کا خلط ہے تو تجربہ سے طے ہو چکا ہے کہ دنیا بوجہ عاجل ہونے کے نفوس کو جلدی اپنی طرف مائل کرتی ہے،تو دنیا و دین کا جامع بنانا مآل کار دنیا دار بنانا ہے،تو ایسا مدرسہ بھی دنیوی مدرسہ ہوگا جو مذہبی دارالعلوم نہیں بن سکتا۔دوسری غرض دارالعلوم سے خادمادن مذہب کا پیدا کرنا ہے اور خدمت مذہب کے لیے صرف تحصیل علوم ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے سخت ضرورت ہے تقدس و تعشق دین وخلوص وللّٰہیت وتوکل وقناعت وتواضع وانکسار وتحمل مشاق ومصائب کی۔اور خلط دنیا کے ساتھ یقینی اور مشاہد ہے کہ یہ صفات پیدا نہیں ہوسکتیں۔نیز ان صفات کے پیدا ہونے میں ان اوصاف والوں کی صحبت طویلہ کو،اور صحبت بھی بلا شرکت ان کے اضداد کے،بڑا دخل ہے۔اور خلط کی صورت میں یا تو ایسی صحبت ہی میسر نہ ہوگی،یا اگر ہوئی تو بوجہ خلط دنیا کے ان کے اضداد کی معیت ان آثار کو ضعیف کرتی رہے گی۔غرض ایسی جگہ کی آب وہوا دینی ومذہبی نہیں ہوسکتی۔اور بدوں اس کے یہ اوصاف نہیں پیدا ہوسکتے ،اور بدوں ان اوصاف کے کوئی خادم دین بن نہیں سکتا،تو ایسے مخلوط مدرسہ سے خدام دین نہیں پیدا ہوسکتے،اس لیے وہ دار العلوم بھی نہیں بن سکتا۔(خطبات حکیم الامت:۵۲/۳۰،۵۳،ت:صوفی اقبال،مولانا زاہد محمود،ادارہ تالیفات اشرفیہ،ملتان،ط:۱۴۲۸ھ)

اور فرماتے ہیں:اور میں تو آج کل اس (دستکاری کی تعلیم کو طلبہ کے لیے)بہت ہی ضروری سمجھتا ہوں،کیونکہ ایسا شخص جو کسی قسم کا پیشہ اور ہنر جانتا ہو مخلوق کو دھوکہ دے کے دنیا نہ کمائے گا۔جیسا آج کل بہت لوگوں نے پیرزادگی کا جال پھیلا رکھا ہے۔اور بہت سے نااہلوں نے وعظ گوئی کو ذریعہ معاش بنالیا ہے۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینی مدارس میں دستکاری کی شاخ کھول دی جائے،کیونکہ ہر کام کا ایک اصول ہوتا ہے۔بے اصول

کوئی کام سرسبز نہیں ہوتا۔ پس دستکاری کی تعلیم کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس کو دینی تعلیم کے ساتھ منضم کیا جائے۔ کیونکہ پھر دونوں کے مدغم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اول اول انضمام ہوتا ہے، پھر انجام کار ادغام ہوجاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دینی تعلیم کا نام ہی نام رہ جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو جہاں دستکاری کی ضرورت ہے وہاں اس سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ ان میں ایسے افراد پیدا ہوں جو علوم دین میں متبحر ہوں۔ اور تجربہ ہے کہ دینی تعلیم میں تبحر اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ طالب علم تعلیم دین کے وقت ہمہ تن اسی طرف متوجہ ہوں، اور دستکاری کی شاخ مل جانے کے بعد توجہ منقسم ہوجائے گی۔ اس لیے دین میں تبحر حاصل نہ ہوسکے گا۔ اسی لیے میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ دینی مدارس میں تقریر ومناظرہ کے لیے کوئی شعبہ قائم کیا جائے۔ کیونکہ تجربہ ہے کہ طالب علم تقریر ومناظرہ میں زمان تعلیم کے وقت مشغول ہوکر پھر کتابوں میں پوری توجہ نہیں کرتے جس سے ان کی کتابی استعداد ناقص رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کاموں کے لیے مستقل مدارس قائم کیے جائیں۔ دینی مدارس میں محض مسائل دین اور ان کے مقدمات کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اور دستکاری کے مدرسوں میں محض دستکاری کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اور مناظرہ کے مدارس میں محض مناظرہ کی تعلیم ہونی چاہیے۔ اس طرح جو شخص جس مدرسہ سے فارغ ہوگا وہ اس کام میں ذی استعداد اور فاضل ہوگا۔ (مصدر سابق: ۳۰/ ۳۴۵، ۳۴۶)

اس سے واضح ہوا کہ دینی مدارس میں دینی علوم اور عصری فنون کے امتزاج کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اور طلبہ کو عصری فنون سکھانے کی صحیح صورت کیا ہے؟ اگر بالفرض پہلے کسی دور میں یہ امتزاج کامیاب رہا بھی ہو، تب بھی یہ اجتماع موجودہ دور کے زمینی حقائق اور معروضی حالات سے میل نہیں کھاتا۔

اس بارے میں اکابرین دیوبند کے اصل موقف کی مزید تصریحات کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

۱: سوانح قاسمی: ۲/ ۲۷۶-۲۸۷، مولانا مناظر احسن گیلانی، دار العلوم دیوبند

۲: احسن التفہیم لمسئلۃ التعلیم: حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، دار النعیم، مکتبہ سید احمد شہید، لاہور، سنہ ندارد

۳: نصاب ونظام دینی مدارس: ص ۱۳۱-۱۵۴، حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی، ناشران قرآن لمیٹڈ، اردو بازار لاہور، سنہ ندارد

۴: ماہنامہ بینات: حضرت بنوری نمبر: ص ۲۲۷-۲۳۱، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی، محرم تا ربیع الاول ۱۳۹۸ھ/ جنوری، فروری ۱۹۷۸م

۵: معارف شیخ الحدیث (مولانا محمد زکریا): ص ۱۸۲-۱۸۵، مرتب: حافظ محمد اکبر شاہ، زمزم پبلشرز، کراچی، ط: ۲۰۰۷م

٦:الہدایات المفیدۃ:حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی ،احسن الفتاوی :١/ ٤٢٥-٤٢٨،ایچ ایم سعید ،کراچی، ط:١٤٢٥ھ

٧:دینی مدارس میں دنیوی تعلیم :مفتی ابولبابہ شاہ منصور،ماہنامہ وفاق المدارس ،ذی الحجہ ١٤٣٣ھ،ص٢٣-٣١

(و):بقدرضرورت معقولات کی تعلیم:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں (ترجمہ):علم منقول غذا کی طرح مقصود ہے۔اورعلم معقول دوا کی طرح ضروری ہے،اس کے لیے جومنقول کی فرض کفایہ مقدار حاصل کرنے لگےاوراس کا ذہن دلیل میں معقول کے بغیر غلطی سے نہ بچ سکے۔ضروری چونکہ بقدرضرورت ہوتا ہے،اوراس کی مقدار ذہنوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔تو جتنی مقدار سے ضرورت پوری ہوجائے بس اتنی مقدارضروری ہوگی ۔اور جسے ضرورت بھی نہ ہواورنقصان بھی نہ ہواس کے لیے معقولات سیکھنا مباح ہے۔اور جسے نقصان ہواس کے لیے مذموم ہے۔اور جتنا نقصان ہواسی کے لحاظ سے کراہت اورحرمت ہوگی۔(امدادالفتاوی:٤/ ٧٧،مکتبہ دارالعلوم کراچی، ط:١٤٣١ھ)

اورفرمایا:اگرعلم دین کے ساتھ معقول کواس غرض سے پڑھا جائے کہ اس سے فہم واستدلال میں سہولت ہوجاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جونحو وصرف و بلاغت وغیرہ کا حکم ہے،کہ یہ سب علوم آلیہ ہیں،اگران سے علم دین میں مدد لی جائے تو تبعا ان سے بھی ثواب مل جاتا ہے۔(تحفۃ العلماء:١/ ٥١٢،٥١٣،ت:مفتی محمد زید،مکتبہ سیداحمد شہید،اکوڑہ خٹک،سنہ ندارد)

جب کبھی آپ (حضرت مفتی محمد شفیع) آپ کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کودرس نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والد صاحب اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے۔اوراس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر،حدیث،فقہ ،اصول فقہ اورعقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی ہیں۔اوراگرقدیم منطق وفلسفہ کو بالکل دیس نکالا دے دیا جائے تو اسلاف کی ان کتابوں سے خاطرخواہ استفادے کی راہ مسدود ہوجاتی ہے ۔جو ہمارا گرانقدر علمی سرمایہ ہیں۔اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کی تعلیم سے ذہن کوجلاملتی ہے اور ذہن مسائل کومرتب طریقے سے سوچنے کا عادی بن جاتا ہے اوراس طرح یہ علوم تفسیر،حدیث،فقہ اور اصول فقہ کے مسائل سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگران علوم کی اصل حقیقت کوذہن نشین کر کے کوئی شخص اس نیت سے ان علوم کو پڑھے پڑھائے کہ ان سے دینی علوم کی تحصیل میں مدد ملے گی توان علوم کی تحصیل بھی عبادت بن جائے

گی۔اور درس نظامی کے مرتبین نے اسی وجہ سے ان کو داخل درس کیا تھا۔اور حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت بخیر ہوتو ہمارے نزدیک بخاری پڑھانے والے اور قطبی پڑھانے والے میں کوئی فرق نہیں۔دونوں اپنی اپنی جگہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور دونوں کی خدمت موجب اجر وثواب ہے۔(البلاغ :حضرت مفتی محمد شفیع نمبر:۱/ ۳۵۸،مکتبہ دار العلو کراچی،ط:۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵م) معقولات کو نصاب سے بالکل خارج کرنے کا انجام :دیکھیے :جہان دیدہ:ص۲۲،۲۳،مکتبہ معارف القرآن،کراچی،ط:۱۴۳۱ھ)

۱۲: ختامہ مسک

حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:غرض علم واخلاق،خلوت وجلوت اور مجاہدہ وجہاد کے مخلوط جذبات ودواعی سے ہر دائرہ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان (علمائے دیوبند) کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی۔جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔اسی لیے ان کے محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث بیزار ہوجانے یا نسبت احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علم الکلام کی حذاقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں، بلکہ اس جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث،فقیہ،مفسر،مفتی،متکلم،صوفی (محسن) اور حکیم ومربی ثابت ہوا۔اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم ومعرفت، جامع عقل وعشق، جامع عمل واخلاق، جامع مجاہدہ وجہاد، جامع دیانت وسیاست، جامع روایت ودرایت، جامع خلوت وجلوت، جامع عبادت ومدنیت، جامع حکم وحکمت، جامع ظاہر وباطن اور جامع حال وقال ہے۔اس مسلک کو جو سلف وخلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے،اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند دینا مسلم،فرقۃ اہل سنت والجماعت، مذہبا حنفی،مشربا صوفی،کلاما اشعری،سلوکا چشتی ،بلکہ جامع سلاسل ،فکرا ولی اللہی ،اصولا قاسمی ،فروعا رشیدی اور نسبتا دیوبندی ہے۔(تاریخ دار العلوم دیوبند:ص۲۳،۲۵ملخصا)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے جمعرات ۳۰ نومبر ۱۹۴۰ م کی شب دار الحدیث دارالعلوم دیوبند میں طلبائے دارالعلوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آپ حضرات کو ابھی اس نعمت خداوندی کی قدر نہیں ہے کہ اس نے آپ کا تعلیمی رشتہ دارالعلوم دیوبند سے منسلک کردیا ہے۔جب اس بسم اللہ کے گنبد سے آپ باہر نکلیں گے اور کتاب و سنت اور فقہی مسائل کی تعبیر میں آپ کو افراط وتفریط کا ایک بھیانک منظر نظر آئے گا،اس وقت معلوم ہوگا کہ دیوبند اور اس کا معتدل مسلک کیسی عظیم نعمت ہے۔

میں بھی طالب علمی کے زمانے میں آپ کی طرح محض اپنے والد مرحوم کے حکم کی تعمیل میں دارالعلوم سے

متعلق ہوا، یہاں کے اساتذہ سے اپنے حوصلہ کے مطابق علم حاصل کیا اور مسلک دیو بند تقلیداً اختیار کیا، لیکن دنیا کے نشیب و فراز اور سرد و گرم دیکھنے، فرقہ وارانہ مباحث سے گزرنے کے بعد اپنی تحقیق سے اس مسلک کے اعتدال کی خوبیاں مستحضر ہوئیں۔ وطن کے اعتبار سے تو میں دیو بندی فطرتاً تھا۔ اور مسلک کے اعتبار سے تقلیداً۔ لیکن طویل غور و فکر بحث و تمحیص کے بعد مسلک دیو بند کے اتباع کا محض تقلید سے نہیں، بلکہ بصیرت سے پابند ہوں۔ (ماہنامہ الرشید: ص ۱۵۷)

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے دارالعلوم دیو بند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا:

''اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید و سنت پر اپنی توجہ مرکوز کی اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اسکو عزیز ہے۔ دوسری خصوصیت اتباع سنت کا جذبہ اور فکر ہے۔ تیسری خصوصیت تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر و حضوری اور ایمان و احتساب کا جذبہ ہے۔ چوتھا عنصر ہے اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش اور دینی حمیت و غیرت۔ یہ چار عناصر مل جائیں تو دیو بندی بنتا ہے، اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہو جائے تو دیو بندیت ناقص ہے۔ فضلائے دارالعلوم دیو بند کا یہی شعار رہا ہے، اور وہ ان چاروں چیزوں کے جامع رہے ہیں۔'' (کاروان زندگی: آپ بیتی مولانا ابوالحسن علی ندوی، ۲/ ۳۱۰، ۳۱۱، مکتبہ اسلام، لکھنو، ط: ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ م)

خلاصہ یہ کہ مدرسہ دیو بند اہل سنت و الجماعت کے منقول و متوارث مذہب کی علمی و عملی ہر دو طرح جامع، معتدل اور صحیح ترجمانی ہی کا نام ہے۔

اسلام زندہ باد ☆ دیو بند پائندہ باد

ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین باد

مدرسہ کے اموال میں احتیاط کی ضرورت

سب سے اول اپنے عزیزوں کو، اپنے دوستوں کو اور اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو اس کی نصیحت اور وصیت کرتا ہوں کہ مدرسہ کے مال میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مدرسہ کے اوقات کا بہت ہی اہتمام کریں، یہ نہ سمجھیں کہ مجھے کون ٹوک سکتا ہے؟! یہ اللہ کا مال ہے، اور اس کا مطالبہ کرنے والا اور اس پر ٹوکنے والا بڑا سخت ہے؛ جس کے یہاں نہ کوئی سفارش چلے گی نہ وکالت۔

(شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ، آپ بیتی، ج: ۱، ص: ۶۶۲)